جلتے خیموں کی چیخ
احمد حسین شمس

جلتے خیموں کی چیخ
احمد حسین شمس

★

تعداد :- ایک ہزار
اشاعت :- مارچ ۱۹۸۱ء
قیمت :- پانچ روپے
مطبوعہ :- جنرل پرنٹنگ پریس کشن گنج
سرورق :- راشد کمال قدوائی
کاتب :- محمد ابراہیم زرّین رقم بناسی

ملنے کا پتہ

(۱) کوثر منزل، لائن کشن گنج ۸۵۵۱۰۷
(۲) کلچرل اکیڈمی۔ رینا ہاؤس جگ جیون روڈ گیا۔
(۳) بک امپوریم، سبزی باغ پٹنہ ۴
(۴) شان ہند۔ انصاری مارکیٹ۔ دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲
(۵) کتاب منزل۔ سبزی باغ پٹنہ۔ ۴
(۶) اسکول دکان۔ انسان اسکول۔ کشن گنج ۸۵۵۱۰۷

الف :

"جلتے خیموں کی چیخ" ہماری قومی زندگی میں پھیلی ہوئی دھند اور محرومیوں کے بیچ جھلسی ہوئی تمام اکائیوں کا ایک بے ساختہ نوحہ ہے جس میں فنکار جگہ جگہ چیلنج سے ٹکراتا ہے اور ہمت سے سچ کہنے کا خطرہ مول لیتا ہے۔ یہ بات زندگی جھیلنے اور اس کی داخلی حقیقت کو جاننے سے بیدار ہوتی ہے۔ فنکار کا رویہ زندگی اور سماج کی طرف وہی ہے جو ایک باشعور شہری کا ہونا چاہئے۔ وہ تخلیقی آزادی کے ماحول میں ایک نئی روح پھونکتا ہے اور اپنی بصیرت کو قائم رکھتے ہوئے اندرون ملک کے بحران کی تلخ اور بھیانک سچائیوں کا حق ادا کرتا ہے۔

اس طویل نظم کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے کا ذیلی عنوان ہے۔ "دہشت" جس میں شاعر کے تصور میں مولانا الطاف حسین حالی اپنے مخصوص انداز اور لب و لہجے کے ساتھ موجود نظر آتے ہیں اور تشویش و حیرت کے المیے سے دوچار ہیں۔ اور کچھ سبق آموز باتوں کی تلقین کے بعد شہر خفتہ کو جگا کر واپس ہو جاتے ہیں۔ دوسرے حصے کا ذیلی عنوان "خلفشار" ہے۔ جہاں فنکار ایک چشم دید گواہ کی حیثیت سے سلگتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ اپنی جھیلی ہوئی زندگی کی گرفت میں وہ خود جکڑا ہوا ہے۔

پہلے حصے میں روایتی ترکیبوں، تشبیہوں اور استعاروں سے کام زیادہ لیا گیا ہے۔ مگر دوسرے حصے میں جگہ جگہ عصری فنّی تقاضوں کے اثرات خاص طور پر نمایاں نظر آتے ہیں۔

اس طرح کی طویل نظموں میں اکثر فنکار مبلغ واعظ اور جرنلسٹ بن جاتے

ہیں۔ مگر شمس اپنی پوری تمازت کے ساتھ خالص شاعر کی حیثیت رکھتا ہے وہ کسی خاص نظریے یا رجحانات کا حامی نہیں۔ پوری نظم پڑھ جائیے آپ کو ماننا پڑے گا کہ اس کا مذہب انسانیت، مسلک صلح کل اور مشرب مرنجاں مرنج ہے اور یہ کہ یہ ایک سچا وطن دوست ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ خلفشار کے ہر بند میں اتنی بے باکی اور دلیری نظر آتی ہے۔

شاعر نے خارجی بحران کے ذریعہ باطنی گونج پیدا کرنے کی بھرپور سعی کی ہے۔ جو ایک طویل تجرباتی کشید سے اخذ شدہ وجدانی سلسلہ ہے۔ نظم کے اشارتی اور غیر اشارتی تناؤ اور بکھراؤ میں گہرے صدموں کی الجھی ہوئی لہریں موج زن ہیں۔ شاعر کا لہجہ حالات و کیفیات کے نئے نئے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ دھیما اور کبھی تند نظر آتا ہے مگر اس میں طنزیہ بے باکی اور تیکھا پن قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس نظم میں سلاست اور روانی اس طرح ہے جیسے ایک کہستانی آب جو لہراتی بل کھاتی ہوئی گذر رہی ہو۔ برساتی ندیوں جیسا شور و ہنگامہ نہیں۔ شاعر کلاسک کا سچا شعور رکھتا ہے۔ نظم کی زبان کا ڈھانچہ متناسب ہے۔ تلمیحات، استعارے اور علامتوں کے انتخاب اور اختراع میں شاعر نے باریک بینی سے کام لیا ہے۔ عام فہم لفظوں کو شعری پیکر میں ڈھال کر اس میں نئی معنویت کو جگہ دی ہے۔ ہندی بازاری اور بعض جگہ نامانوس لفظوں کو بڑی چابک دستی سے شعر کے قلب کا ایک جزو بنا دیا ہے۔ گو یہ نظم بیانیہ انداز میں لکھی گئی ہے۔ مگر جگہ جگہ ایسے ایسے اشعار نظم ہوئے ہیں جو اپنے آپ میں لاتعداد باریکیاں، نفاستیں لئے ہوئے اور ضرب المثل بننے کے امکان کے حامل ہیں۔ کہیں کہیں شاعر کو اجتماعی دکھ درد کو اپنانے کے حوصلے میں تخلیقی عمل کے دوران ایسے لمحے گرفت میں آئے ہیں۔ جو آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیتے ہیں۔

گو یہ طویل نظم ایک مقامی نظم ہے۔ اس کے زماں و مکاں کی حدود اربعہ ہندوستان اور صرف ہندوستان کو محیط ہیں۔ اس کے باوجود بعض بعض بند ایسے بھی ظہور میں آگئے ہیں جنہیں ہم اگر آفاقی کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ ؎

ہر انسان دوراہے پہ گم سم کھڑا ہے
جگر کی خبر ہے نہ دل کا پتا ہے
زمیں سے یکایک جدا ہو گیا ہے
شجر سے کوئی خشک پتا گرا ہے

نفس کو بگولے کا ہر آن ڈر ہے
کہ چھت پھونکنے کو بہت اک شرر ہے

جہاں تک فن شاعری کا تعلق ہے میں نہیں کہتا کہ یہ طویل نظم فنی غلطیوں سے بالکل پاک و صاف ہے۔ لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ کہیں کہیں قدرے کرخت اور اکھڑی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ مگر پھر بھی اس میں داخلی معنوی حسن موجود ہے۔ بہر کیف شمسؔ نے ایک مرقع پیش کیا ہے۔ تصویریں ساکت بھی ہیں متحرک بھی۔ ہر بند اگرچہ الگ الگ مضمون پر مشتمل ہے مگر سلسلے کے سارے بند ملکر ایک اکائی بن جاتے ہیں۔

جلتے خیموں کی چیخ، سماج کی تمام غلاظتوں اور لعنتوں کا منفرد شعری اظہار ہے۔ اور میں یہ کہوں تو کوئی مضائقہ نہ ہوگا کہ یہ ادبی صداقت اور حقیقت پسندی کا ایک بہترین نمونہ بھی ہے۔

علی امام

انسان اسکول۔ کشن گنج۔ ۸۵۵۱۰۷

٦
دہشت
نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

سُہانی فضا تھی پہر دن چڑھا تھا
سرِ رہ گذر جاؔن کلبی کھڑا تھا
چراغ اس کے اِک ہاتھ میں جل رہا تھا
بڑے غور سے سب کو وہ دیکھتا تھا
کسی نے یہ پوچھا یہ کیا دِلّگی ہے
تلاشش آپ کو آج کس چیز کی ہے

ؔ جان کلبی : یونان کا ایک مشہور مفکر۔

کہا صبح سے جستجو میں لگا ہوں
نہ اب تک کوئی آدمی پا رہا ہوں
تذبذب میں خود آج میں پڑ گیا ہوں
پڑی جس پہ بھی آنکھ کیا دیکھتا ہوں
کہ دو پانو کا جانور جا رہا ہے
ادھر آ رہا ہے اُدھر جا رہا ہے

یہی آج بھی شمسؔ ہم دیکھتے ہیں
جفا دیکھتے ہیں ستم دیکھتے ہیں
تماشائے دیر و حرم دیکھتے ہیں
بشر کا مگر سر قلم دیکھتے ہیں
کہاں سو گئے آج گلشن کے مالی
یہ کس نے اڑا لی رخِ گل کی لالی

یہ بھارت کبھی اہل دل کا وطن تھا
جہاں میں یہ گہوارۂ علم و فن تھا
حیات آفریں آب گنگ و جمن تھا
یہاں حسن کا لہلہاتا چمن تھا
مگر رہ گیا دفعتًا باغ اُجڑ کر
ملے خاک میں پھول آپس میں لڑ کر

دل غمزدہ کچھ سکوں چاہتا تھا
معًا چھا گیا ایک گہرا کہا سا
لگا گھٹنے دم بڑھ گیا یوں اندھیرا
مگر جب ہوا صاف کہرا تو دیکھا
کھڑے ہیں زمیں پر عصا کو سنبھالے
مد و جزر اسلام کے لکھنے والے

---

۱ کہاسا۔ یہ ٹھیٹھ بہاری لفظ ہے بمعنی کہرا ● مد و جزر اسلام: حضرت حالی کی مشہور تصنیف جو عرف عام میں مسدس حالی سے مشہور ہے۔

بصد التجا ہم نے حالیؔ میاں سے
یہ پوچھا کہ آپ آ رہے ہیں کہاں سے
کہا آج ہم آ رہے ہیں وہاں سے
پلٹ کر نہ آتا ہے کوئی جہاں سے
مگر ہند کی بے بسی نے پکارا
تڑپنے لگا ناگہاں دل ہمارا

صدی نصف گزری بہشت بریں میں
کٹا وقت شغل مے و انگبیں میں
نہ دشمن عقب میں نہ رہزن کمیں میں
نہ دہشت جگر میں نہ وحشت جبیں میں
جدھر دیکھئے عیش و عشرت کے ساماں
ادھر حور و غلماں ادھر حور و غلماں

کبھی میرؔ آئے کبھی ذوقؔ آئے

رقیبوں کے فرضی فسانے سنائے

کبھی میرزا نوشہ تشریف لائے

خود اپنے ہی شعروں کے معنی بتائے

مگر آج اچانک اٹھی ایک آندھی

نمودار جس میں ہوئی روح گاندھی

وہ منجدھار کا ناخدائے سفینہ

وہ بھارت کی انگشتری کا نگینہ

وہ معصوم دل آرزو کا خزینہ

مگر تھا لہو سے شرابور سینہ

کہا کیوں بہشت آج مرجھا رہی ہے

وطن سے یہ کیسی ہوا آ رہی ہے

وہ دیکھو کوئی بے زباں جل رہا ہے

محبت کا نام و نشاں جل رہا ہے

تمناؤں کا آشیاں جل رہا ہے

کہ ناموس ہندوستاں جل رہا ہے

کوئی ہے کمربستۂ بے وفائی

کوئی چیختا ہے دہائی دہائی

دہائی کی دل دوز آواز سن کر

لگے کانپنے خوف سے ہم سراسر

کہیں اس کی آنچ آنہ جائے فلک پر

جھلس کر نہ رہ جائیں خورشید و اختر

غریبوں کی آہوں میں پنہاں شرر ہے

زبانوں میں ان کی بلا کا اثر ہے

وہ سابرمتی کا مرن ہو رہا ہے
ہمارے وطن کا پتن ہو رہا ہے
کسی بے گنہ کا دہن ہو رہا ہے
کہ نرمیدھ یگ کا ہون ہو رہا ہے
پھر اک بار ان بدقماشوں کی ٹولی
لگی کھیلنے خون گاندھی سے ہولی

یہ نانک کی آغوش چشتی کا دامن
مہاویر کا دیش گوتم کا آسن
یہ رشیوں کا گلزار مُنیوں کا اُپون
سیاور کی دھرتی کنہیا کا مدھ بن
پھر اس دیش میں کنس پیدا ہوا کیوں
ستم گار راون ہویدا ہوا کیوں

● سابرمتی : گاندھی جی کا مشہور آشرم ● مرن : موت ● دہن - جلنا ● نرمیدھ یگ : انسانی قربانی کا یگ ۔
● ہون : پوجا کے وقت آگ میں شکر شہد کرگھی کا جلانا :

غریبوں کی غربت بڑھی جا رہی ہے

امیروں کی دولت بڑھی جا رہی ہے

کمینوں کی جراُت بڑھی جا رہی ہے

رذیلوں کی حرکت بڑھی جا رہی ہے

مگر دل سے ایمان گم ہو رہا ہے

یہی پریم کی مے سے خم ہو رہا ہے

کوئی رات دن ناچ گانے کی دھن میں

کوئی ایک کے سو بنانے کی دھن میں

کوئی دو دِلوں کو لڑانے کی دھن میں

کوئی راج پر حق جتانے کی دھن میں

بس اک فکر تعمیر ملّت نہیں ہے

وطن سے کسی کو محبّت نہیں ہے

• آسن ۔ بیٹھنے کی جگہ • اُپون ۔ پھلواری • سیاور ۔ رام جی • کنھیا ۔ کرشن جی • کنس ۔ جس نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا ۔ اور جسے ہلاک کرنے کے لئے کرشن جی آئے تھے ۔

یہ کل تک جو انگریز کے تھے پیامی
جنہیں دل سے مرغوب تھی بس غلامی
بنے ہیں وہی "رہبرانِ" گرامی
وہی آج بن بیٹھے بھارت کے سوامی
نہ کیوں عندلیب آج روئیں چمن کو
کہ سونپے گئے پھول زاغ و زغن کو

خرد کھو گئی ہے یقیں کھو گیا ہے
ضمیر آدمی کا کہیں سو گیا ہے
کوئی تخم تخریب کا بو گیا ہے
خدا جانے کیا ہند کو ہو گیا ہے
جہاں دیکھئے عقل سے دور باتیں
جہالت کے دن ہیں حماقت کی راتیں

• سوامی: مالک

محبت کا مسکن یہاں ہر مکاں تھا
جہاں میں لقب اس کا جنت نشاں تھا
یہ سرسبز شاداب اک گلستاں تھا
کبھی رشکِ فردوس ہندوستاں تھا
مگر چند سفّاک ظالم لُٹیرے
اسے لوٹ بیٹھے سویرے سویرے

کٹی تھی غلامی کی زنجیر ابھی تو
سنورنے یہ آئی تھی تقدیر ابھی تو
مصوّر تھے مصروف تدبیر ابھی تو
کہ تھی زیر تکمیل تصویر ابھی تو
یہ کم بخت صبر و سکوں چھوڑ بیٹھے
یہ مزدور محنت سے مُنہ موڑ بیٹھے

نشاں پریم کا دل سے یوں مٹ گیا ہے
کہ انساں اب انساں نہیں بھیڑیا ہے
ترقی کوئی شخص اگر کر رہا ہے
تو ہر آدمی اس کے پیچھے پڑا ہے
کسی آنکھ میں اب مروّت نہیں ہے
یہ قصّاب خانہ ہے بھارت نہیں ہے

محبّت گراں ہے عداوت ہے سستی
کہیں خود ستائی کہیں خود پرستی
چلے ہیں مسافر مگر سوئے پستی
گئی ڈوب دلدل میں بستی کی بستی
غرض ہر طرف ایک حیوانیت ہے
اب انسان باقی نہ اِنسانیت ہے

یہاں کون سا دل پریشاں نہیں ہے
یہاں کون سی آنکھ گریاں نہیں ہے
کہ اب کوئی مفہوم احساں نہیں ہے
یہ انسان سب کچھ ہے انساں نہیں ہے

نہ رنگِ حیا ہے نہ بوئے وفا ہے
ہیں کاغذ کے پھول ان میں رکھا ہی کیا ہے

کہا ہم نے اے خالق بزم امکاں
ہمارا چمن کیوں ہوا نذر طوفاں؟
ہیں کیوں عندلیبانِ گلشن پریشاں
یہ کس راکشش کے کرم کا ہے احساں!

اجازت اگر ہو تو جائیں وطن کو
فقط اک نظر دیکھ آئیں وطن کو

یتیموں کے وہ آہ و نالہ نہ پوچھو
ضعیفوں کے وہ حالِ خستہ نہ پوچھو
ہر اک سمت وُہ شور و غوغا نہ پوچھو
یہاں آ کے جو ہم نے دیکھا نہ پوچھو
کہیں ریزہ ریزہ ہیں سلمیٰ و سیتا
کہیں پارہ پارہ ہیں قرآن و گیتا

سڑک پہ کہیں لاش عریاں پڑی ہے
وہیں ایک معصوم بچی کھڑی ہے
بہت لیڈروں کی دُھما چوکڑی ہے
مگر جس طرف دیکھئے گڑ بڑی ہے
کہیں گرم بازارِ عصمت فروشی
کہیں شور و ہنگامۂ بادہ نوشی

تشدّد کا ہے ہر جگہ بول بالا
قتت
صدا کو ہر دل نے دل سے نکالا
ہیں ویران مسجد، کلیسا، شوالا
عزازیل نے راج گویا سنبھالا
یہاں گاندھیت کا مذاق اڑ رہا ہے
سر رشتہ فاشزم سے جڑ رہا ہے

ادھر بلبل خستہ جاں رو رہی ہے
ادھر محنت باغباں رو رہی ہے
ادھر بزم کرّوبیاں رو رہی ہے
ادھر محفل کہکشاں رو رہی ہے
زمیں کو ہے سکتہ سکوت آسماں کو
نظر لگ گئی کس کی ہندوستاں کو

فلاکت ہی گویا ہے قسمت وطن کی
لگیں دھجّیاں اڑنے ہر پیرہن کی
وہ تصویر ناگفتنی ہے چمن کی
کہ بہتی جہاں نہر شہد و لبن° کی
وہاں خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں
ستم پر ستم بلبلیں سہہ رہی ہیں

ہوائیں بس آہ و فغاں ڈھو رہی ہیں
زمانے کی آنکھیں لہو رو رہی ہیں
نگاہیں نگہبان کی سو رہی ہیں
سَتی آج بھی عورتیں ہو رہی ہیں
مٹے بھوک مذہب کی فصل جنوں سے
بجھے دھرم کی پیاس انساں کے خوں سے

° لبن۔ دودھ۔ ° دھرم: بروزن شرم۔ بروزن کرم غلط تلفظ ہے ° ستی۔ بیوی کا اپنے شوہر کی چتا میں جل مرنے کو ستی ہونا کہتے ہیں۔ اس صدی میں کچھ واقع ہو چکے۔

جو کمزور ہیں صرف غوغا مچائیں
مگر جان کی خیر ہر دم منائیں
رہیں بند گھر میں تو خود کو جلائیں
جو بھاگیں تو بندوق کی زد پہ آئیں
برہمن کے گن ہیں کپٹ ناگ کی ہے
ہریجن کے گھر ہیں لپٹ آگ کی ہے

جو کاہل ہیں رہتے ہیں ہر دم پریشاں
سمجھتے ہیں تحصیل دولت کو آساں
بہت من چلے ریس کے مرد میداں
جوا، لاٹری جن کے ہیں دین وایماں
نہیں جیب میں کچھ مگر دیکھتے ہیں
تماشا یہ گھر پھونک کر دیکھتے ہیں

• کپٹ: عیارانہ چال۔مکاری۔ • ریس دوڑ گھوڑ دوڑ کی بازی سے مراد ہے

کبھی جو چڑھاتے تھے لک چھپ کے ساغر
لنڈھاتے ہیں اب تو وہ کنٹر پہ کنٹر
دکھاتے ہیں اپنی شرافت کے جوہر
بڑا ان کا احسان ہے محفلوں پر
ہوا میں اڑے باپ دادوں کی عزّت
مگر برق رفتار ہے ان کی شہرت

کہہ و مہہ، زن و مرد سب ہیں سوالی
ہے گودام بھرپور، بازار خالی
اُدھر سیٹھ جی نے تجوری سنبھالی
اِدھر بھوک نے ایک ارتھی نکالی
غریبوں کے نالوں نے چھت پھوڑ دی ہے
گرانی نے سب کی کمر توڑ دی ہے

• کنٹر: پیپا۔ • ارتھی۔ جنازہ۔

برہمن اُدھر عیش فرما رہے ہیں

ادھر راچھوت آج اٹھلا رہے ہیں

کہیں ویس بنئے ستم ڈھا رہے ہیں

کہیں تسکر اپنے کو پجوا رہے ہیں

کہاں سوگئی عقل ہندوستاں کی

خبر وقت کی ہے نہ سدھ بدھ مکاں کی

کہیں شیخ کو برہمن سے خصومت

کہیں شیخ سے برہمن کو شکایت

محبت کے حامی محبت سے نفرت

خدا کے پُجاری خدا سے بغاوت

یہ منطق نہیں کوئی جادو گری ہے

یہ مذہب نہیں غمزۂ سامری ہے

• تسکر۔ اسمگلر • سامری۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانے کا مشہور جادوگر۔

یہودی، مسیحی، مسلمان، ہندو
بداندیش، بدبیں، بداخلاق، بدخو
نہیں ان میں توصیف کا کوئی پہلو
زباں پر ہے قدرت نہ دل پر ہے قابو
یہ بندے ہوس کے ہیں دشمن خدا کے
نہیں جانتے کچھ بھی معنی وفا کے

کہیں گائے کا ذکر آنے پہ جھگڑا
کہیں ڈھول باجا بجانے پہ جھگڑا
کہیں ووٹ دینے دلانے پہ جھگڑا
کہیں مہرہ آگے بڑھانے پہ جھگڑا
بصد شوق لڑتے ہیں شاطر لڑائی
کہ ہے چند سیٹوں کی خاطر لڑائی

عجب حال تعلیم کا بھی ہوا ہے
کہ استاد لڑکوں کا نوکر بنا ہے
کبھی پیٹھ پر اس کی پتھر لگا ہے
کبھی اس کے سینے پہ خنجر چلا ہے
یہ توقیر استاد کی ہو رہی ہے
یہ تعمیر بنیاد کی ہو رہی ہے

کہا تھا کبھی میں نے غصّے میں آکر
نکمّے ہوئے لڑکے اسکول جا کر
"نہ پڑھتے تو سو طرح کھاتے کما کر
یہ کھوئے گئے اور تعلیم پا کر"
مگر فرق ہے اُس صدی اس صدی میں
کہ اب سب کے سب مبتلا ہیں بدی میں

• "یہ شعر مسدس حالی سے ہے۔

انہیں لکھنے پڑھنے سے مطلب ہی کیا ہے
یہ کالج نہیں ہے کلب گھر کھلا ہے
در فیض تعلیم مخلوط وا ہے
سبق عاشقی کا لیا جا رہا ہے
اب ان کی نگاہوں سے ٹرینیں ہراساں
بسیں ان کے دم سے ہمیشہ پریشاں

گداموں کے ٹھیلے کہیں ٹھیلتے ہیں
یہ بدبخت پاپڑ یونہی بیلتے ہیں
نصیبے کو روتے ہیں دکھ جھیلتے ہیں
گھرانے کی عزت سے یوں کھیلتے ہیں
بہت ڈینگ اسلاف کی ہانکتے ہیں
یہ حضرت مگر خود چنا پھانکتے ہیں

• ٹرینیں : Train ریل گاڑی •

کمر تک بڑھی زلف ہپّی بنے ہیں
شریفوں کے لڑکے ہیں لڑکی بنے ہیں
چرس، بھنگ، گانجے کے عادی بنے ہیں
نمائندۂ بے حیائی بنے ہیں
نہ کی تھی کمی باپ نے تربیت میں
مگر گھور اندھیرا ہے ان کے جگت میں

سیاست ہوا کی طرح چھا رہی ہے
ہر انسان کے دل کو برما رہی ہے
نحوست مگر سر پہ منڈلا رہی ہے
کوئی جان لیوا بلا آ رہی ہے
یہ نادان انجام سے بے خبر ہیں
جسے کاٹتے ہیں اِسی ڈال پر ہیں

• جگت ۔ دنیا ۔

بہار اور بنگال، آسام، اڑیسہ
تلنگانہ، گجرات، یو پی، کرالا
غرض ساحل بحر سے تا ہمالا
محبت کے دریا میں نفرت کا دھارا
کوئی ناگ ہے کنس پھنکارتا ہے
کنہیا کی غیرت کو للکارتا ہے

یہ کب تک جفا رقص عریاں کرے گی
رخِ شیطنت کو نمایاں کرے گی
وفا و حیا کو ہراساں کرے گی
گل و یاسمن کو پریشاں کرے گی
"سدا ناؤ کاغذ کی چلتی نہیں ہے
کبھی ظلم کی شاخ پھلتی نہیں ہے"

• کنس کے حکم پر کالکا نامی ناگ جمنا کے پانی کو زہر آلود کر رہا تھا۔ کرشن جی نے جمنا میں غوطہ لگایا اور اس کا کلہ چیر کر ہلاک کر دیا۔ اس شعر کا اشارہ اسی واقعہ کی طرف ہے • اسماعیل میرٹھی کا شعر بقدر ترمیم۔

ستم پیشہ راون عدم کو سدھارا
گیا جان سے کنس سفاک مارا
ہوا ختم نمرودیت کا اجارا
گیا ڈوب فرعونیت کا ستارا
وہ چنگیز، نیرو، ھلاکو کہاں ہیں
وہ اٹلی و جرمن کے ڈاکو کہاں ہیں

کہا ہم نے فرمایئے خواجہ صاحب
بنائے مصیبت ہے روٹی کہ مذہب
کہا یہ تبہ کاریاں اصل میں سب
جہالت کے فن ہیں تعصب کے کرتب
جہاں ہوش میں آ گئے ہندوالے
تو کونین پر چھا گئے ہندوالے

• اٹلی و جرمن کے ڈاکو سے مراد مسولینی اور ہٹلر ہیں۔

ذرا بخش دو وسعت اپنی نظر کو
مسرت ملے دل کو راحت جگر کو
بنا لو گے دار السّلام اپنے گھر کو
گرہ باندھ لو قول خیر البشرؐ کو

"کرو مہربانی تم اہل زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پر"

جسے دھرم کہتے ہیں آخر وہ کیا ہے
خدا تک پہنچنے کا اک راستہ ہے
محبت روا ہے ہوس نا روا ہے
سکوں آرزو ہے وفا مدعا ہے
غرض درد دل روح ایمان کی ہے
کہ مذہب کا اک نام اخلاق بھی ہے

تعصب ہے بنیاد بے گانگی کی
تکبّر علامت ہے دیوانگی کی
مشقت نشانی ہے فرزانگی کی
مصیبت کسوٹی ہے مردانگی کی

یہ دُنیا فقط ایک دارالعمل ہے
وہ زندہ رہے جس کے بازو میں بَل ہے

ضرورت ہے بھارت کو اہلِ ہمم کی
نئی طرح ڈالے جو دیر و حرم کی
گرا دے جو دیوارِ ظلم و ستم کی
کہ ہو ملک تمثیل باغِ ارم کی

گل و لالہ کھل کے پھیلائیں ہر سو
مساوات کے رنگ اُلفت کی خوشبو

• بل - طاقت

اِدھر مختصر داستاں ہو رہی تھی
اُدھر صبح صادق عیاں ہو رہی تھی
نگاہوں سے ظلمت نہاں ہو رہی تھی
کرن نور کی ضو فشاں ہو رہی تھی
زمیں بھی ہے اپنی چمن بھی ہے اپنا
مگر خام ابھی تک ہے باپو کا سپنا

بڑے غور سے ہم نے اپنی کہانی
سنی حالیؔ نوحہ خواں کی زبانی
ہوا اگرچہ دل شرم سے پانی پانی
مگر کچھ لگی کسمسانے جوانی
گئے شمس حالیؔ دل افگار کر کے
مگر شیر خفتہ کو بیدار کر کے

کہاں جائیں ہم جنس برباد لے کر
جگر کی لہکتی ہوئی یاد لے کر
جلن بخشتی ہے ہوس داد لے کر
کریں کیا مشینوں کی ایجاد لے کر
اُدھر کھیت پر ٹڈیاں اُڑ رہی ہیں
اِدھر چھت سے چنگاریاں اڑ رہی ہیں

کہیں دروپدی کی حیا جل رہی ہے
کہیں جانکی کی وفا جل رہی ہے
کہیں پدمنی کی صدا جل رہی ہے
غرض ہر جگہ اک چتا جل رہی ہے
یشودھا کے نندن کہاں سو گئے ہیں
رگھوکل کے لڑکے کہاں کھو گئے ہیں

• دروپدی: پانڈوؤں کی بیوی • جانکی: سیتا • پدمنی: ایک نہایت ہی حسین وجمیل رانی۔
• یشودھا کے نندن: کرشن جی • رگھوکل کے لڑکے: رام اور ان کے تینوں بھائی۔

ظرف شرار

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو وہ اگر شرار ہوتا

تصوّر میں ایک انقلاب آرہا ہے
قیامت کا شاید جواب آرہا ہے
لب بام وہ بے نقاب آرہا ہے
سوا نیزے پر آفتاب آرہا ہے
فلک تپ رہا ہے زمین جل رہی ہے
کوئی آگ کی یکشنی چل رہی ہے

سڑک پر ہیں کچھ لوگ جن کا سراپا
دھڑ انسان کا اور سر جانور کا
کوئی بھیڑئیے کا خطرناک چہرا
کوئی لومڑی کوئی خونخوار چیتا
کہیں ناگ مستی میں بل کھا رہا ہے
کہیں ریچھ غصّے میں غرّا رہا ہے

● یکشنی: دیو مالائی قوم۔ راکشش کی طرح ظالم و جفا کار۔ یکشنی اسی کی مؤنث

جھکائے ہوئے سر اسی رہ گذر پر
کمر خم، رخ افسردہ با دیدۂ تر
وہ ہاڑی کے ڈھانچے فلاکت کے پیکر
کھڑے ہیں بانداز مجرم سراسر
اسیر ستم قیدئ بے بسی ہیں
الٰہی! یہ کس دیش کے آدمی ہیں

بڑی مچھلیاں اینڈتی پھر رہی ہیں
کئی مچھلیاں ان کے منہ میں پھنسی ہیں
بڑوں کی نگاہیں جدھر اٹھ چلی ہیں
مواخات کی گردنیں کٹ گئی ہیں
کریں زور ہرنوں پہ چیتوں کے پنجے
کسیں موم کی مورتوں کو شکنجے؟

وہ کل جو زمیندار تھے آج کیا ہیں!
وفا کیش دیہاتیوں کے خدا ہیں
ابھی بھی یہ سرگرم جور و جفا ہیں
کسانوں کے حق میں شنی دیوتا ہیں
کسی دل جلے نے اگر سر اٹھایا
تو پل بھر میں ہے اس کے سر کا صفایا

یہ دہقان مضراب کی چوٹ کھا کر
بج اُٹھتے ہیں بر ربط صفت جھنجھنا کر
مظالم سے عفریت کے تنگ آ کر
سوئے شہر چل پڑتے ہیں منہ اُٹھا کر
مگر پانو میں گڑ گئے چند کانٹے
یہاں بھی لگے ان کے گالوں پہ چانٹے

• شنی، نحوست کا دیوتا۔ اس سیارے کو زحل کہتے ہیں

سبھا ہر سڑک، ہر گلی انجمن ہے
یہاں پیشے پیشے کا اک یونین ہے
مگر سب کے سر پر جو سایہ فگن ہے
وہ جویائے محنت، خریدار فن ہے
یہاں جس سمیتی کے جو منتری ہیں
امیروں کی صندوق کے سنتری ہیں

دھواں کارخانہ اگلتا رہے گا
مگر خونِ مزدور جلتا رہے گا
جو بھٹی میں لوہا پگھلتا رہے گا
تو لوہے سے ہتھیار ڈھلتا رہے گا
ادھر اہلِ کیں گردنیں کاٹتے ہیں
ادھر اہلِ زر انگلیاں چاٹتے ہیں

• یونین: Union ادارہ • سیمتی ہندی لفظ ہے۔ ادارہ۔

حمیّت کی رگ ڈوبتی جارہی ہے
لب نطق پر خامشی چھارہی ہے
زمین اپنی ہستی پہ شرمارہی ہے
عزازیل کی آنکھ اٹھلارہی ہے
دل و دیں کا سرمایہ یوں لٹ رہا ہے
کہ ہوش و خرد کا بھی دم گھٹ رہا ہے

جماعت کی توقیر اگر فرد سے ہے
تو ہر فرد کی منزلت مرد سے ہے
بگولے کا دم خم کف گرد سے ہے
پھپھولے کی وقعت تپ درد سے ہے
صداقت پہ مبنی جو غیظ و غضب ہو
تو اس جذبۂ دل پہ بھی فضل رب ہو

فسادات ہوتے ہیں شہروں میں اکثر
بقرعید پر یا جنم اسٹمی پر
مگر صاحب عقل ہمدرد لیڈر
پڑے رہ گئے فائلوں میں اُلجھ کر
غرض دھرم مذہب نہ ناموس مطلب
انہیں جنگ سے "تخت طاؤس" مطلب

حقیقت کہوں آپ مانیں نہ مانیں
یہ خود ساختہ لیڈروں کی دکانیں
بہت چلتی ہیں لیکن ان کی زبانیں
اچک بیٹھتی ہیں کسانوں کی جانیں
فقط رنگ تقریر نکھرا ہوا ہے
مگر آج ہر شخص بکھرا ہوا ہے

یہ دِل تو نہیں دَل بدلنے میں ماہر
سبھاؤں میں جا کر اچھلنے میں ماہر
کسانوں کی فصلیں نگلنے میں ماہر
مجوروں کے سر کو کچلنے میں ماہر
اگر کوئی بازار جائے مکاں سے
تو گھر لائے بس چند معکر دکاں سے

—

کبھی سوشلسٹوں کے دار العمل میں
کبھی پونجی پتیوں کے زریں محل میں
ابھی کانگریس میں ابھی لوک دل میں
کبھی بیٹھتے سنگھیوں کے بغل میں
یہ ہیں محض بک ورم ریڈر نہیں ہیں
رئیسوں کے چمچے ہیں لیڈر نہیں ہیں

• مجوروں: مزدوروں کا مخفف ہے • بک ورم: انگریزی لفظ بمعنی کتاب کا کیڑا۔
• ریڈر: یہ بھی انگریزی لفظ ہے۔ قاری۔

یہ تک بھی ہے کوئی کہ بلبل سے اُلّو

کہے اس چمن سے نکل جا ابھی تو

وگرنہ چلاؤں گا وہ تجھ پہ جادو

کہ بہہ جائیں آنکھیں تری بن کے آنسو

یہ تاریک شب ہے سویرا نہیں ہے

ابھی راج میرا ہے تیرا نہیں ہے

میں باز آیا ایسی وطن دوستی سے

کہ نفرت کرے آدمی آدمی سے

ہے دونوں کو پریم اپنی اپنی خودی سے

تجھے تیرگی سے مجھے روشنی سے

ترے حسنِ منطق پہ قربان میں بھی

مگر ہوں چمن کا نگہبان میں بھی

تمنّاؤں کے دل کو ڈستی ہے ناگن
خرد کا کلیجا چباتی ہے ڈائن
ہے سکتے کے عالم میں کوئی ابھاگن
لگیں ٹوٹنے چوڑیاں چھن چھنا چھن
خود اپنا پیالہ ہی پھوٹا ہوا ہے
ہر انسان اندر سے ٹوٹا ہوا ہے

قلم کار، فن کار، عالم سخن ور
پریشان و گم گشتہ خود اپنے اندر
نظر آسماں پر مگر جی مکدّر
کہ بیٹھی ہے کیوں بھوک آسن جما کر
شب و روز دکھ دہر کا بھوگتے ہیں
غریب اپنے سینوں میں غم جوگتے ہیں

بہت پیشہ ور اپنے پیشوں کی رونق
زمانے کو حیران کرتے ہیں ناحق
جسے تاک لیں چہرا اس کا ہوا فق
نہیں ان کی باتوں میں اخلاص مطلق
لہو چوسنے کا اک آلہ بنے ہیں
پڑی جن پہ چشم کرم لٹ گئے ہیں

کچہری میں ہے گرم بازار رشوت
ہوئی چشم انصاف قربانِ دولت
چڑھی داؤں پر اب شریفوں کی عزت
مگر جوش پر ہے کمینوں کی نخوت
اس انداز سے ہنس رہی ہے رذالت
لرزتی ہے میزانِ عدل و عدالت

وہ ناموس انسانیت کی نگہباں
وہ خوابیدہ گلزار کی چشم پنہاں
تفنگوں کے حق میں وہ پرغیظ طوفاں
وہ لا اینڈ آرڈر کی شمشیر بُرّاں
پولس جس کے دم پر مدار وطن ہے
پولس جس کے ہاتھ انحصار وطن ہے

وہی آج قانون کو توڑتی ہے
یہ کم بخت اپنگوں کے سر پھوڑتی ہے
ادھر اپنی ڈیوٹی سے منہ موڑتی ہے
لٹیروں سے رشتہ اُدھر جوڑتی ہے
وہی آبروئے وطن لوٹتی ہے
بہو بیٹیوں کا چمن لوٹتی ہے

Law and Order. • اپنگوں: ہندی لفظ بمعنی اپاہیج

مٹھوں کے مہنت اور چرچوں کے فادر
بہت خانقاہوں کے فرخندہ رہبر
مئے و نان، پرشاد، تعویذ دے کر
مریدوں سے بس اینٹھتے رہتے ہیں زر
جسے علم شد بد ہے کھاتا بہی کا
وہ راز آشنا بن گیا آگہی کا

کھلی ایک ایسی ہوس کی پٹاری
کہ ہر آدمی چور ہے یا بھکاری
حرم کے نگہباں، صنم کے پجاری
فقط بہر زر کاٹ دیں عمر ساری
انہیں فکر عقبےٰ نہ پرلوک کا غم
تقدس کی پوشاک شیطاں مجسّم

• مئے و نان: عید فسح پر حضرت مسیح علیہ السلام نے روٹی کا ٹکڑا اپنے شاگردوں کو دے کر کہا کہ یہ میرا جسم ہے اسے کھاؤ۔ اور افشردہ انگور دیکر کہا کہ یہ میرا خون ہے اسے پیو۔ یہ رسم آج تک عیسائیوں میں چلی آ رہی ہے۔ مئے و نان سے اشارہ اسی طرف ہے۔

وہ تہذیبِ نو کے "اسیرانِ فیشن"

بکف جام رنگین گل نو بدامن

اب ان کے گلستاں ہیں نرگس نہ سوسن

نظر نادرِ پیرس، زباں وقفِ لندن

یہ مغرب کی قے بے جھجک چاٹتے ہیں

مگر اپنے گھر کا گلا کاٹتے ہیں

اجاڑ کو بھی دو پیسے کوئی تھما دے

تو وہ بھی فلک بوس بلڈنگ ڈھا دے

مگر اس سے کہئے کہ اک گھر بنا دے

تو وہ جھینپ کر سر نفی میں ہلا دے

بلو پرنٹ اِنجنئیر کا قلم ہے

محل دستِ فن کار کا اک صنم ہے

• بلو پرنٹ: Blue print

بڑھی اس قدر آج بے روزگاری
کہ ہر جان خود اپنے تن پر ہے بھاری
نتیجہ بہر سمت چوری چھناری
کہیں خوں خرابہ کہیں آہ و زاری
درِ دولت آباد بند ان دنوں ہے
شکستہ قدم ہر سمند ان دنوں ہے

نرنکاریوں کی وہ تلوار چمکی
وہ سکھوں کی شمشیر خونخوار چمکی
جو شیعوں کی چشم شرربار چمکی
تو سنّی کی خوں ریز گفتار چمکی
لہو چھینٹ کر اپنی اپنی حویلی کو
سجانے لگے دیوبند و بریلی

• نرنکاری: سکھوں کا ایک نیا فرقہ۔

نمک تیل چینی زبانوں کو ترسیں
پیاز اور لہسن دکانوں کو ترسیں
نگاہیں فقط چند دانوں کو ترسیں
مرے کان پچھلے فسانوں کو ترسیں
مساوات لانے پہ بنئے اڑے ہیں
فقیر اور امیر ایک صف میں کھڑے ہیں

مشینوں نے جذبات کو پیس ڈالا
مسلط اندھیرا ہوا دور اجالا
بشر کا وجود آج ہے بکنے والا
ہے سوداگری کا فقط بول بالا
اب الجھی ہے تقدیر ایجاد نو میں
رہا کیا بجز شور فریاد نو میں

وہ معصوم گل، جس پہ سولہ بہاریں
بصد ناز و انداز جاں اپنی واریں
نزاکت کو جس کی اُنگلیں ابھاریں
صباحت ملاحت کو کرنیں نکھاریں
چڑھا بھینٹ بد روح کے تھان پر وہ
فدا ہوگیا باغ کی آن پر وہ

کل آنگن میں اک لاڈلی جل رہی تھی
ابھی جس کے ہاتھوں میں مہندی رچی تھی
خطا میں خطا اس دلہن کی یہی تھی
جہیزوں کی فہرست میں کچھ کمی تھی
سسر ساس سر پہ چڑھے بھوت بن کر
تلک لے گیا جان یم دوت بن کر

• تھان: استھان کا مخفف ہے بمعنی پوجا کی جگہ • یم دوت: ملک الموت • تلک: ہندوؤں (اور اب مسلمانوں کے یہاں بھی) کی مذموم رسم۔ لڑکے والے لڑکی والوں سے ہزاروں روپیہ نقد لیکر شادی کرتے ہیں۔

ہوئیں نذر آتش محبت کی قدریں
بہیں اشک ہو کر مروت کی قدریں
لٹیں بر سرِ عام عصمت کی قدریں
گئیں ڈوب دریا میں عزت کی قدریں
اَب اخلاص باقی نہ احساس باقی
کسی گل میں رنگت نہ بو باس باقی

مکاں چھوڑ کر اہل فن بھاگتے ہیں
طلب گارِ گوہر عدن بھاگتے ہیں
ختن سے نکل کر ہرن بھاگتے ہیں
پئے رزق داشنگٹن بھاگتے ہیں
یہاں جاہلوں کو تو ملتی ہے عزت
مگر عالموں کی نہیں کوئی وقعت

زمینوں کو جو آسماں کر دکھاتے
وطن کو ثریا کے اوپر بٹھاتے
لبِ گنگ ذروں کو سورج بناتے
زراعت سے سونے کی فصلیں اُگاتے
وہ فن کار غیروں کے کام آ رہے ہیں
یہ شاہین پسر زیرِ دام آ رہے ہیں

دل و ذہن میں انقباض اس قدر ہے
کہ ہر سمت وحشت حریفِ نظر ہے
خرافات کا بوجھ ہر پیٹھ پر ہے
رہینِ الم، وقفِ غم ہر بشر ہے
معیشت کی عقلیں ہراساں کھڑی ہیں
نمک دان میں چیونٹیاں گھس پڑی ہیں

مقدس کتب طاق نسیاں کی زینت
بلو فلم ساماںِ تسکین و راحت
بزرگوں کے اقوال زریں سے نفرت
حیا سوز گانوں سے کانوں کو رغبت
سینما تھیٹر کے رسیا بنے ہیں
جوا چوری کے تین تیا بنے ہیں

ذرا ٹوکئے تو جھگڑ بیٹھتے ہیں
یہ شہ زورے ہوا سے بھی لڑ بیٹھتے ہیں
سڑک جام کر دیں جو اڑ بیٹھتے ہیں
یہ جھکتے نہیں جب اکڑ بیٹھتے ہیں
یہ امن و سکوں کا جگر نوچتے ہیں
شکاری کبوتر کے پر نوچتے ہیں

• بلو فلم : یہ بلا بھی امریکہ اور یورپ کی لائی ہوئی ہے۔ جنسیات پر عریاں اور فحش تصویروں کی فلم۔ ایسی فلمیں حکومت کی نظروں سے چرا کر بنائی بھی جاتی ہیں۔ اور چھپ کر دیکھی بھی جاتی اسکا چلن بھی عام ہوتا جا رہا ہے۔

ہر انساں دوراہے پہ گم سم کھڑا ہے

خبر ہے جگر کی نہ دل کا پتا ہے

زمیں سے یکایک جدا ہو گیا ہے

شجر سے کوئی خشک پتا گرا ہے

نفس کو بگولے کا ہر آن ڈر ہے

کہ چھت پھونکنے کو بہت اک شرر ہے

چمن کا چمن رہ گیا ہے جھلس کر

برستی ہے آگ آسماں سے زمیں پر

تعصب، توہم، تفکر کے اجگر

فضا کو نگلتے ہیں جا جا کے گھر گھر

کلیجا مفاہیم کا پھٹ گیا ہے

دماغ ارضِ افکار سے کٹ گیا ہے

اِک آئینہ ناگاہ فرشِ زمیں پر
گِرا اور گِر کر ہوا چور یکسر
سلامت ہے زنگار اس کا نہ جوہر
فقط کرچیاں رَہ گئی ہیں بکھر کر
یہاں فرد فرد آج بِکھرا ہوا ہے
بیَاباں میں بالو کا ٹیلہ کھڑا ہے

انا ظلمتوں کے گپھا میں پڑی ہے
غمِ دہر کی کشمکش میں گھری ہے
بصد کرب خود کو صَدا دے رہی ہے
مگر شمعِ ادراک چُپ ہو گئی ہے
زماں دم بہ دم قہقہہ مارتا ہے
مکاں کے تصوّر کو للکارتا ہے

حقیقت کی نظروں سے دیکھیں اگر ہم
تو پائیں گے ہر سو رُخ بزم برہم
لپکتے ہیں زخم اور ناپید مرہم
کہیں شمسؔ کس منہ سے خود کو بشر ہم

ہواؤں میں بے زاریاں اُڑ رہی ہیں
نگاہوں میں چنگاریاں اُڑ رہی ہیں

وہ افسر کہ بخشندہ ہیں نوکری کے
عطا کرتے ہیں زعم میں خودسری کے
چڑیلوں کے چہروں پہ مکھڑے پری کے
کمینوں کے سر پہ عمامے زری کے
مگر ان کی گردن پہ کب چھوڑتے ہیں
لہو چوس لیتے ہیں جب چھوڑتے ہیں

اگر رشتہ داروں نے عرضی گزاری
تو وہ سیکڑوں اہلِ فن پر ہیں بھاری
اِدھر نہرِ زر جہل کے گھر ہیں جاری
اُدھر علم کے لب پہ اک آہ و زاری
نہ جانے جو مفہوم ہی اِندر سَبھا کا
وہ بھائی بنا اندر کی اروشی کا

خوشامد بنی شیوۂ اہلِ بھارت
اِسی فن پہ موقوف ہے سب تجارت
ہے دربار داری میں اتنی مَہارت
کہ عزت بھی معدوم غیرت بھی غارت
جہاں دیکھتے ہیں پر افشاں سخن کو
وہاں بھیج دیتے ہیں بیٹی بہن کو

• اندر: بروزن فعل ہے۔ بروزنِ فعلن نہیں۔ یہ بیکنٹھ کا راجہ ہے • اروشی: اس کی بزم کی خاص و محبوب رقاصہ

بزرگوں کی عزت نہ بچوں پہ شفقت
بہن سے محبت نہ بھائی سے الفت
نہ منادر سے رشتہ نہ مسجد سے نسبت
ہوس ان کی دیوی خدا ان کا دولت
پجاری بنے ہیں فقط سیم و زر کے
یہ کُتّے رہے گھاٹ ہی کے نہ گھر کے

غلامانِ زر جان و تن بیچ دیں گے
حجابات کے پیرہن بیچ دیں گے
گل و لالہ و نسترن بیچ دیں گے
جو موقع ملے تو چمن بیچ دیں گے
یہ دوشیزگی کی ضیا لوٹتے ہیں
یہ دیوّث گھر کی حیا لوٹتے ہیں

بشر ہیں وقارِ بشر ہی نہیں ہے
گھر ہیں کچھ آب گھر ہی نہیں ہے
سفر ہے، کوئی ہم سفر ہی نہیں ہے
کسی کو کسی کی خبر ہی نہیں ہے
ہے یوں گرچہ شہر اور بستی میں میلا
نظر آرہا ہے ہر انساں اکیلا

ملک جانور، جن، ستارے، شرارے
جبلّت سے مجبور سارے کے سارے
مگر دل دماغ اور اعضا ہمارے
کسی دست فنکار نے یوں سنوارے
کہ عالم کے محبوب اگر ہیں تو ہم ہیں
زمانے کے مطلوب اگر ہیں تو ہم ہیں

زمانہ گرفتارِ بد انتظامی
فضا دق زدہ شمع کی لو جذامی
ہے تہذیب دوغلی تمدّن حرامی
کریں ہم ملاوٹ کے فن کی غلامی
بلا سے اپاہج بنے قوم ساری
مگر بھر تو جائے تجوری ہماری

ہے دولت تو مریخ پر جا سکو گے
زمیں چاند کی رَوند کر آ سکو گے
فلک کا جگر کاٹ کر لا سکو گے
ہما کو بھی ڈھونڈے سے تم پا سکو گے
مگر خوردنی چیز خالص کہاں ہے
زمیں سخت ہے اور دور آسماں ہے

بغیر اِذن پتی بھی ہلتی نہیں ہے
دکانوں میں کیا چیز ملتی نہیں ہے
وہ کون آستیں ہے کہ سلتی نہیں ہے
کلی کون سی ہے جو کھلتی نہیں ہے
ذرا چور بازار جا کر تو دیکھو
جو مانگو ملے گا جو چاہو خریدو

زمینوں، سفینوں، مکانوں کی لعنت
تواریخ کی، داستانوں کی لعنت
علاقوں کی لعنت، زبانوں کی لعنت
مسلّط ہے سب پر نشانوں کی لعنت
یہ لعنت قیامت اُٹھا کر رہے گی
جہانِ سکوں کو مٹا کر رہے گی

زمیں پہ اک اک دانہ بکھرا ہوا ہے
کہ مالا کا رشتہ ہی ٹوٹا ہوا ہے
سِوِک سینس ہی ہم سے روٹھا ہوا ہے
نہ جانے کہاں ہوش بھاگا ہوا ہے
فراوانئ غم سے بے تاب ہو کر
بشر رہ گیا آج سیماب ہو کر

اگر جل اٹھے سازِ مطرب فغاں سے
تو نغمے نہیں آگ نکلے زباں سے
نکیں ہاتھ دھولیں اب اپنے نکاں سے
برستی ہیں چنگاریاں کہکشاں سے
فلک چھید اٹھیں گرم آہوں کی سینخیں
دھڑکنے لگیں جلتے خیموں کی چیخیں

• سوک سینس: Sivic sense. تمدنی و معاشرتی احساس۔

قطعہ

مجرم کی سزا سے کہیں مٹتے ہیں جرائم
ہے دل کی دوا پریم میں نشتر میں نہیں ہے
تم لاکھ صنم توڑو کروڑوں ہی بنیں گے
بت ذہن برہمن میں ہے پتھر میں نہیں ہے

افتاد کی مقصد نہیں تسلیم و رضا کا
ہے سعیٔ مسلسل میں نہاں راز وفا کا
ہر شخص کی قسمت میں ہے طوفاں سے تصادم
وہ مرد ہے جو پھیر دے رخ موج بلا کا

شمس

نام : احمد حسین

تخلص : شمس

قلمی نام (۱۹۷۳ سے قبل) : شمس بن گرامی

قلمی نام (۱۹۷۳ کے بعد) : احمد حسین شمس

پیدائش : ۱۹۲۱ء

جائے پیدائش : بن گرام (سنتھال پرگنہ)

سکونت : کشن گنج

پتہ : کوثر منزل، لائن کشن گنج ۸۵۵۱۰۷

مطبوعات :-

ناول : نذرانہ (۱۹۵۲ء)

" : اور ... وہ آتی رہی (۱۹۵۳ء)

مضامین : غالب کی باتیں (۱۹۵۵ء)

" : گوکسی (۱۹۶۳ء)

نظم : منظوم اردو قواعد (۱۹۷۲ء)

" : جلتے خیموں کی چیخ (۱۹۸۱ء)

غیر مطبوعہ : قطعات کا مجموعہ • غزلوں اور نظموں کا مجموعہ
ہندی کنڈلیوں کا مجموعہ • اور دھرتی کانپ اُٹھی (ناول)
حاتم بھائی (ناول)
مہرشی اسلام (ہندی ترجمہ رحمۃ اللعالمین (شبلی نعمانی)